ذیشان احمد مصباحی
اُستاد، جامعہ عارفیہ
سید سراواں، الٰہ آباد (ہندوستان)

صوفیانہ شاعری میں اسلام اور محبت: ایک تجزیاتی مطالعہ

ABSTRACT

Islam and love in Sufi Poetry: An analytical study.
By Zeeshan Ahmed Misbahi, Teacher, Jamia Aarfia Syed Sarawan, Allahbad (India).

Mystic poetry in Urdu and Persian raises many questions for the sheer reason of poetic diction and style of certain Sofie poets such as Fariduddin Attar, Jalaluddin Rumi and Khwaja Mir Dard. Such questions may be summed up as: Did the Sufi poets not care about the tenets of Islam? Did they not value the real spirit of Islam? What is the real intent behind the apparently blasphemous couplets to be found in some sofie poets? This article tries to find out the answers to such disturbing questions, quoting vastly from Urdu and Persian poets. The writer emphasizes that unless some terminologies used in mystic poetry and Sufism are understood these couplets remain as arcane and mysterious as the ideas of mysticism itself. He laments that the apparent meanings of Sufi poetry are taken literally and hence the Islamic Sofie poets are blamed for blasphemy.

’’کفر کافر را و دیں دیندار را‘‘

حضرت فریدالدین عطار کے اس مصرع پر جب نظر پڑتی ہے تو ایک لمحے کے لیے جھٹکا لگتا ہے، لیکن اگلے ہی لمحے یہ خیال گزرتا ہے کہ شاید حضرت عطار نے آیت ربانی: لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ (الکافرون:٦) کا ایک بلیغ شعری پیکر تراشا ہے، لیکن جب ہمارے سامنے شعر کا دوسرا مصرع آتا ہے:

’’ذرۂ دردت دلِ عطّار را‘‘

تو تشویش بڑھ جاتی ہے اور عصر حاضر کے مولویانہ ذہن پر، جو شعر و ادب اور ذوق تصوف کا آشنا نہیں رہا، کئی ایک سوالات جنم لینے لگتے ہیں، مثلا:

۱۔ کیا حضرت عطار کو دین کی ضرورت نہیں تھی؟
۲۔ کیا وہ دین دار نہیں تھے؟ کیا وہ فسق و فجور میں ڈوبے ہوئے تھے؟ یا انھیں تقویٰ اور دین داری عزیز نہیں تھی؟
۳۔ کیا دین سے برگشتہ ہو کر صرف درد و محبت میں ڈوبے رہنا اسلام یا تصوف ہے؟
۴۔ کیا عطار کا شمار بے دین اور باطل پرست صوفیہ میں ہوتا ہے؟

۵۔ اور سب سے آخری بات یہ کہ آخر صوفیہ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں جن کے اندر بظاہر دین کی خفت یا اسلام کی اہانت کا پہلو نکلتا ہے؟

مذکورہ بالا سوالات اس وقت مزید اضافات کے ساتھ مستحکم ہو جاتے ہیں، جب دیگر اکابر صوفی شعرا کے یہاں یہی مضمون مختلف اسالیب میں ملتا ہے، مثلاً:

عمر خیام کہتے ہیں:

رندے دیدم نشستہ بر خنگ زمیں | نہ کفر و نہ اسلام و نہ دنیا و نہ دیں
نہ حق نہ حقیقت نہ شریعت نہ یقیں | اندر دو جہاں کرا بود زہرہ ایں

(خاک زمین پر ایک دیوانے کو میں نے بیٹھا ہوا دیکھا، جس کے اندر نہ کفر ہے نہ اسلام ہے، نہ دنیا ہے اور نہ دین ہے، نہ حق ہے اور نہ حقیقت ہے اور نہ ہی ایمان و شریعت ہے، پھر میں غور کرنے لگا کہ دو جہاں کے اندر یہ پھول پھر کس کا ہے؟)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اندر نہ دین ہے، نہ دنیا ہے، پھر کیا ہے؟ نہ کفر ہے نہ اسلام ہے، بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے؟

مولائے روم کہتے ہیں:

چوں دلم بتکدہ شد آزر گوبت متراش | چوں سرم معصرہ شد خانۂ خمار مگیر
کفر و اسلام کنوں آمد و عشق از ازلست | کافرے را کہ کشد عشق نہ کفار مگیر

(جب خود میرا دل بت کدہ ہو گیا، اب آزر کو بت تراشی سے منع کر دو، میرا سر خود ہی شراب کی بھٹی بن گیا، اس لیے اب شراب خانے کو چھوڑ دو۔ کفر و اسلام آج کی پیداوار ہیں، جب کہ عشق ازل سے ہے، جو کافر کو قتل کر رہا ہے وہ کفار سے عشق نہ چھین لے۔)

سوال یہ ہے کہ کیا اسلام سے ہٹ کر بھی کوئی ایسا عشق ہے جو محمود ہے، جو ازل سے ہے؟ اور کیا یہ عشق کافروں میں بھی ہوتا ہے اور اگر ہوتا ہے تو وہ محمود کیوں ہوتا ہے؟ اسے تو مذموم ہونا چاہیے۔

شیخ سعدی شیرازی فرماتے ہیں:

صلحست میان کفر و اسلام | با ما تو ہنوز در نہ بندی

(کفر و اسلام کے درمیان بھی صلح موجود ہے، لیکن اس کے باوجود تو میرے ساتھ کوئی تعلق استوار نہیں کرتا۔)

سوال یہ ہے کہ کفر و اسلام کے درمیان صلح کہاں سے آ گئی؟ اور ایسی صلح آئی بھی تو یہ تو مذموم ہے۔ سعدی اس کا حوالہ کیوں دے رہے ہیں؟

کفر و اسلام کا مضمون حضرت امیر خسرو کو بھی بہت عزیز ہے، فرماتے ہیں:

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست — ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست
خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند — آرے آرے می کنم با خلق مارا کار نیست

(میں کافرِ عشق ہوں، مجھے اسلام کی کوئی حاجت نہیں اور اب مجھے زنار کی حاجت بھی نہ رہی۔ کیوں کہ میری ہر رگ، زنار کا دھاگہ بن چکی ہے۔ لوگ اب یہ کہنے لگے کہ خسرو بت پرست ہوگیا۔ ہاں ہاں میں بت پرست ہوگیا۔ مجھے لوگوں سے کیا مطلب!)

سوال ہے کہ اسلام اور مسلمانیت سے منزہ ہوکر، کافرِ عشق بن کر، جسم کے رگ رگ کو بطورِ زنار استعمال کر کے، خسرو کہاں جا رہے ہیں؟ یہ کون سا دین ہے؟ یہ کون سا تصوف ہے؟ اور انتہا یہ ہوگئی کہ فخریہ طور پر اپنی بت پرستی کا اعلان بھی کر رہے ہیں۔ آگے خسرو دو قدم اور بڑھ گئے:

ما و عشق یار اگر در قبلہ و در بت کدہ — عاشقان دوست را با کفر و ایماں کار نیست
یک قدم بر جان خود نہ یک قدم بر دو جہاں — زیں نکوتر رہروان عشق را رفتار نیست

(عشق محبوب کی دولت کعبہ یہ بت کدہ جہاں مل جائے، ہمارے لیے غنیمت ہے۔ محبوب کے عاشقوں کو کفر و ایمان سے کیا غرض؟ دو قدم آگے بڑھو اور اپنی جان اور دونوں جہان سے گزر جاؤ۔ رہ روان راہ محبت کے لیے اس سے بہتر رفتار اور کیا ہوسکتی ہے۔)

سوال یہ ہے کہ کفر و ایمان سے الگ رہنے والے یہ عشاق کون ہیں جن کو صرف عشق سے غرض ہے؟ وہ اس کے لیے کعبہ و بت خانے کی تمیز بھی نہیں کرتے۔ جو تلاش عشق کے سفر میں خود کو بھی فنا کر دیتے ہیں اور دونوں جہان کو بھی اپنے پیروں تلے روندتے ہوئے گزر جاتے ہیں؟ اور کیا ایسے اسلام بیزار لوگ صوفی اور متقی ہوسکتے ہیں؟ یہ تصوف ہے یا زندقہ ہے؟

عہد وسطی کے معروف عالم و زاہد اور عصر جدید کے بیشتر چشتی و قادری مشائخ کے مقتدا حضرت میر عبدالواحد بلگرامی لکھتے ہیں:

> ''جب عشاق کا رنگ صبغۃ اللہ (اللہ کا رنگ) ہے تو وہ جس طرح بھی ہو، ومن احسن من اللہ صبغۃ (کون ہے اللہ سے بہتر رنگ میں) کا جلوہ دیکھتا ہے۔''

شرف در عشق او گشت آن قلندر — کہ ہفتاد و دو ملت یار دارد

(اے شرف! اس کے عشق میں وہی قلندر رہوا جو بہتر فرقوں کو دوست رکھتا ہے۔)

عظمت والے رب کی قسم! میں ابھی یہیں پر تھا کہ ایک بھائی کا خط پہنچا اور اس کے بعد اس شعر نے بہت ذوق دیا:

کافرم گر کفر را دارم قبیح — مشرکم گر آورم ایماں صریح

(میں کافر ہو جاؤں، اگر کفر کو برا جانوں اور مشرک ہو جاؤں، اگر صراحتاً ایمان کا دعویٰ کروں۔)

یاد رکھو کہ ہر کفر میں ایک ایمان ہے اور ہر ایمان میں ایک کفر۔

درون ہر بتے جانیست پنہاں　　　　بزیر کفر ایمانیست پنہاں

(ہر بت میں ایک جان پوشیدہ ہے اور کفر کے اندر ایمان چھپا ہوا ہے۔)(۱)

سوال یہ ہے کہ ۷۲ رفرقوں کو عزیز رکھنے والے اس قلندر کا عقیدہ کیسا ہے، وہ ہدایت میں مبتلا ہے یا ضلالت میں؟ کفر کو پسند کرنے والا اور ایمان صریح سے بھاگنے والا یہ شخص کون ہے، جس کے ذکر سے میر عبدالواحد بلگرامی ذوق پا رہے ہیں اور محظوظ ہو رہے ہیں؟ وہ کون سا ایمان ہے جو کفر کے اندر پوشیدہ ہے؟ اور جو لوگ ایسی باتیں کہہ رہے ہیں ان کو پیشوا اور مقتدا بنانے والوں کا حکم شرعی کیا ہے؟

اودھ کے ایک اور نامور صوفی شاعر آئین خسروی کے پرستار منشی عزیز اللہ صفی پوری نغمہ زن ہیں:

ندانم کہ ایماں چہ و کفر چیست　　　　گر ایں بود در آں فدائے تو شد

مومن پاک است محمد پرست　　　　کفر مکن بندۂ یزداں مباش

(مجھے نہیں خبر کہ ایمان کیا ہے اور کفر کیا ہے؟ جو کچھ بھی ہو تیرے قدموں پر نثار ہو جائے۔ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پرستار ہی صحیح معنوں میں مومن ہے، اللہ کا بندہ بن کر کافر مت ہو جاؤ۔)

اعلیٰ حضرت مولانا شاہ علی حسین اشرفی کچھوچھوی کا تصور کفر و ایمان بھی دیکھیے:

مکن اے زاہد خشک اعتراضے　　　　چہ دانی سرّ توحید خدا را

اگر گوئی مرا تو بت پرستے　　　　بگویم در بتاں دیدم خدا را

کفر و اسلامم بزلف وروئے او وابستہ شد　　　　مذہبم گبر و مسلماں ہر دو شانم شد چہ شد

کلمۂ کفر اولم کرد چو تعلیم شیخ　　　　کفر شد ایمان من سینہ پر انوار شد

(اے زاہد خشک! اعتراض مت کرو، تم اسرار توحید سے بے خبر ہو۔ اگر تم مجھے بت پرست کہتے ہو تو میں کہتا ہوں کہ مجھے بتوں کے اندر ہی خدا نظر آتا ہے۔ میرا کفر و اسلام محبوب کے زلف و رخ سے وابستہ ہے، اس لیے میں نے اسلام و بت پرستی دونوں ہی کو اختیار کر لیا ہے۔ میرے شیخ و مرشد نے جب سب سے پہلے کلمۂ کفر کی تلقین فرمائی اس وقت کفر میرا ایمان بن گیا اور میرا سینہ انوار کا گنجینہ بن گیا۔)

یہ وہ مقامات ہیں کہ اونٹ کی طرح آسمان کو دیکھنے سے ان کی نزاکتوں کا پردہ نہیں کھل سکتا۔ ہمیں بہت سنجیدگی سے یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ صوفیہ کی اصطلاح میں بتوں کے اندر خدا کی موجودگی کا مطلب کیا ہے؟ ان کا مذہب بت پرستی کیا ہے؟ اور وہ کون سا کفر ہے جس کے بعد ان کا سینہ انوار کا گنجینہ بن جاتا ہے؟ یہاں مجھے عصر حاضر کے معروف

ناقد و محقق مولانا ڈاکٹر فضل الرحمن شرر مصباحی کی ایک بات یاد آتی ہے کہ ''آج کل مدرسوں میں تکفیر و تضلیل کا جو بازار عام گرم ہے، اس کے بہت سے اسباب میں ایک سبب قدیم فارسی شاعری سے ناواقفیت بھی ہے۔'' بہر کیف! اس مسئلے پر توضیح و تاویل کے حوالے سے کچھ لکھنے سے قبل چند اُردو شعرا کے کلام بھی ملاحظہ فرمائیں:

بت خانہ و کعبہ کچھ نہ جانا　　　کہاں جائیں خلاف کفر و دیں ہم
اتنے بت خانوں میں سجدے ایک کعبے کے عوض　　　کفر تو اسلام سے بڑھ کر ترا گرویدہ ہے
(آسی غازی پوری)

بت پرستی، کفر، یاں دل کی گرفتاری ہے درد　　　چاہیے جس کو لگے، اس کو صنم کہنے لگے
(درد دہلوی)

غرض کفر سے کچھ نہ ایماں سے مطلب　　　تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں
(سودا)

نہ کافر ہوں، نہ مومن ہوں، نہ عصیاں ہے نہ طاعت ہے　　　غلامِ شاہ خادم ہوں مرا مذہب محبت ہے
(شاہ عزیز صفی پوری)

آشنائے کفر و دیں عاشق نہیں ہوتے ہیں میر　　　جانتے ہیں طور میرے سب چنانچہ خرد و پیر
(میر تقی میر)

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی　　　نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق
(علامہ اقبال)

مطلب نہ کفر و دیں سے نہ دیر و حرم سے ہے　　　کرتا ہے دل طوافِ عذار و طوافِ زلف
(بہادر شاہ ظفر)

ان کی باہوں کے حلقے میں عشق بنا ہے پیر طریق　　　اب ایسے میں بتاؤ یارو کس جا کفر، کدھر ایمان
(ابن صفی)

اسلام و کفر سے تو یہاں کچھ نہیں حصول　　　ہم کو نہیں ہے کافر و دیں دار سے غرض
(مسکین شاہ)

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی　　　کچھ قیدِ رسم نے جسے ایماں بنا دیا
(اصغر گونڈوی)

ایمان وکفر اور نہ دنیا ودیں رہے اے عشق شاد باش کے تنہا ہمیں رہے
(جگرمرادآبادی)

عشق وہ کفر کہ ایمان ہے دل والوں کا عقل مجبور وہ کافر جو مسلماں ہو جائے
(فانی بدایونی)

کہاں ایمان ، کس کا کفر اور دیر وحرم کیسے ترے ہوتے ہوئے اے جاں خیال دوجہاں کیوں ہو
(بیدم شاہ وارثی)

چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کو پوجنا چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر
(مرزا غالب)

کافرِ عشق دلربا کفر سے رکھے عار کیوں مذہب و دیں یہی ہے گر کرے نہ اختیار کیوں
اس عشق نے آزاد کیا دونوں جہاں سے کافر ہوں نہ مسلم ہوں ادھر ہوں نہ ادھر ہوں
(اشرفی میاں)

اصول خمسہ:

۱۔ علم بیان کا ابتدائی طالب علم یہ جانتا ہے کہ الفاظ کے دو معنی ہوتے ہیں؛ (۱) معنی حقیقی اور (۲) معنی مجازی۔ لفظ دونوں معنی میں بولا جاتا ہے۔ جب وہ اپنے معنی حقیقی میں استعمال ہو تو اسے حقیقت کہتے ہیں اور اگر غیر حقیقی معنی میں استعمال ہو تو اسے مجاز کہتے ہیں۔

۲۔ الفاظ کے استعمال میں اصل یہ ہے کہ وہ اپنے معنی حقیقی میں مستعمل ہو، گو یا حقیقت اصل ہے اور مجاز فرع ہے۔ فقہا نے اسی لیے یہ قاعدہ بنایا ہے کہ جب تک لفظ کو اس کے حقیقی معنی پر محمول کرنا متروک، مشکل یا متعذر نہ ہو جائے، اس وقت تک وہاں معنی حقیقی ہی مراد ہوگا۔ ہاں! جب معنی حقیقی مراد لینا، کسی وجہ، کسی قرینے کے سبب ممکن نہ رہے تو اس لفظ کو معنی مجازی کی طرف پھیر دیا جائے گا۔ گو یا اصل یہ ہے کہ لفظ حقیقت ہو اور اپنے معنی حقیقی میں مستعمل ہو، مجاز ہونے کے لیے کوئی قرینہ چاہیے۔ جب تک کوئی ایسا قرینہ نہ ہو جس سے یہ واضح ہو کہ یہاں معنی حقیقی مراد نہیں ہے بلکہ معنی مجازی مراد ہے، اس وقت تک لفظ کو اس کے حقیقی ظاہری معنی سے مجازی معنی کی طرف نہیں پھیرا جائے گا۔ اہل بیان کا فیصلہ ہے کہ قرینہ ہی لفظ کو حقیقت سے مجاز کی طرف پھیرتا ہے، کیوں کہ قرینہ کے بغیر کوئی لفظ بالذات معنی مجازی پر دلالت نہیں کرتا۔

فالقرینة هی المانعة عن الحقیقة الی المجاز،اذا للفظ لا یدل علی المعنی المجازی

بنفسه دون قرينة (۲)۔

۳۔ وہ قرائن جن کے سبب لفظ اپنی حقیقت سے مجاز کی طرف پھیرا جاتا ہے، ان میں ایک قرینہ متکلم کی حالت بھی ہے۔ بسا اوقات متکلم کے احوال یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اس مقام پر لفظ اپنے مجازی معنی میں استعمال ہوا ہے، حقیقی معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ مثلاً علم البیان کے علما نے بالعموم یہ مثال پیش کی ہے کہ ”أنبت الربيع البقل“ (موسم بہار نے سبزہ اگایا)

اگر یہ جملہ کوئی منکر خدا کہے تب تو لفظ کا معنی حقیقی مراد لیا جائے گا لیکن اگر اس کا قائل کوئی موحد ہو، تو اس کا عقیدۂ توحید یہ واضح کرے گا کہ سبزہ اگانے کی نسبت بہار کی طرف حقیقی نہیں مجازی ہے، کیوں کہ قائل ہر فعل کا فاعل اور ہر خلق کا خالق اللہ کی ذات کو تسلیم کرنے والا ہے۔ البتہ موسم بہار سبزہ و شادابی کا ظاہری سبب ہے، اس لیے سبزہ اگانے کی نسبت مجازی طور پر اس نے موسم بہار کی طرف کر دی ہے۔ پہلی صورت میں وہی جملہ، جملۂ کفر تھا، کیوں کہ موسم بہار کو سبزہ اگانے والا مانا گیا ہے، جب کہ دوسری صورت میں وہی جملہ جملۂ ایمان ہے، کیوں کہ اگر چہ بظاہر سبزہ اگانے کی نسبت بہار کی طرف کی گئی ہے، لیکن قائل چوں کہ موحد و مومن ہے اور اس فعل کا حقیقی فاعل اللہ کی ذات کو مانتا ہے، وہ صرف مجازاً سبزہ اگانے کی نسبت بہار کی طرف کر رہا ہے لہٰذا اس کا جملہ معنی حقیقی میں مستعمل نہیں ہے، اس لیے وہ جملہ، جملۂ ایمان ہے نہ کہ جملۂ کفر اور اس پر دلیل قائل کی حالت ایمان و توحید ہے۔

۴۔ اصطلاحات کو لغت سے نہیں، مخصوص فن سے سمجھنا چاہیے جس سے ان کا تعلق ہو، یہ ایک حقیقت ہے کہ لكل عمل رجال (ہر کام کے کچھ خاص مردان کار ہوتے ہیں) اور لكل قوم مقال (ہر قوم اور ہر فن کی خاص اصطلاح ہوتی ہے) اس اصطلاح کو لغت کی کتابوں سے یا دیگر فنون کی اصطلاحات سے سمجھنے والا سخت گمراہیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

۵۔ تصوف صرف ایک حال نہیں، ایک فن بھی ہے۔ شیخ ابو طالب مکی، ابوبکر کلاباذی، امام قشیری، امام غزالی اور مختلف علما نے اس پر فنی گفتگو کی اور فقہ و کلام کی طرح اسے بھی مدون کیا۔ اگر چہ اس کے اندراب تک اصول فقہ اور اصول حدیث کی طرح فنیت اپنے کمال تک نہیں پہنچی ہے تاہم اس کی فنی حیثیت سے کسی ذی علم کو انکار نہیں۔ بطور خاص تصوف جب ایران و سندھ سے ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا، تو اس کی مخصوص اصطلاحات وضع ہوئیں۔ خصوصاً فارسی شاعری کا غالب حصہ تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ صوفیا نے شاعری کو اپنا ذریعۂ اظہار (Medium) بنایا اور نہ صرف اپنے مافی الضمیر کو شاعری کی زبان میں پیش کیا، بلکہ قدیم لفظوں کو اپنے مخصوص احوال و مقامات اور معانی و مفاہیم کے لیے استعمال کیا۔ پھر بعد کے صوفیہ نے اس شاعری کو سمجھنے کے لیے اصطلاحات کی تفسیر و تشریح کی اور صوفیہ کی خاص لفظیات کی تحقیق و تفہیم کے لیے اصطلاحاتِ تصوف کی مختلف

کتابیں تصنیف کیں۔ اب صوفیہ کی مخصوص لفظیات کو سمجھنے کے لیے ان کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور کسی صوفی کے شعر پر کفر وضلالت کے فتوے ٹھونکنے سے قبل یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ صوفیہ اس قسم کے الفاظ و تعبیرات کن معانی ومفاہیم کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

عہد وسطیٰ کا مسلم ہندوستان مکمل طور سے صوفی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ جسے یقین نہ آئے، اس زمانے کے علما اور شعرا کے احوال پڑھ لے۔ ہر شخص کسی سلسلے میں بندھا ہوا اور کسی صوفی کا غلام ملے گا۔ اس وقت صوفیانہ کلام ذوق ولذت کے لیے پڑھا جاتا تھا اور بالعموم کسی کو مجال دم زدن نہیں ہوتا تھا۔ ہندوستان میں جب وہابیت آئی تو اس کے سبب جہاں بہت نئے مسائل ومباحث پیدا ہوئے، وہیں صوفیہ اور صوفیانہ شاعری پر اعتراضات کا ایک غیر متناہی سلسلہ چل پڑا۔ علمائے اسلام نے اپنے عہد میں ان اعتراضات کے جواب بھی دیے، لیکن رفتہ رفتہ تصوف اور صوفیانہ شاعری کی درس و تدریس ان مدارس میں بھی بند ہوگئی جو تصوف نواز اور مشرب صوفیہ کے علم بردار سمجھے جاتے ہیں۔ نتیجے میں اب اس حلقے سے بھی اعتراضات شروع ہونے لگے ہیں۔ ان اعتراضات کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ مدارس میں تصوف اور صوفیانہ شاعری کو پھر سے داخل درس کیا جائے۔ اس سے تشدد اور تکفیر و تضلیل کا بازار یقینی طور پر ٹھنڈا ہوگا اور دوسرا جواب یہ ہے کہ تصوف اور صوفیہ پر ہونے والے اعتراضات کا علمی تصفیہ ہو، علمی مقالات لکھے جائیں اور عرفا کے مقام، ان کی زبان، ان کے مسلک ومنہاج اور ان کے احوال عالیہ سے عامۃ المسلمین کو واقف کرایا جائے۔

اسی طرح صوفیہ کی اصطلاحات کو سمجھنا بھی بہت ضروری ہے۔ لوگ لغت اور فلسفہ وکلام کی اصطلاحات کے سبب تصوف کی تفہیم میں مغالطوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ حضرت مخدوم سمناں سید اشرف جہاں گیر کچھوچھوی قدس سرہ اپنے شیخ حضرت عبدالرزاق کاشانی کے حوالے سے فرماتے ہیں:

> ''جب تک طالب طریقت اور سالک راہ معرفت اس فن کی اصطلاحات کی باریکیوں اور حقائق سے کما حقہ آگاہ نہیں ہوجاتا اور ان کی حقیقت اس کے ذہن نشین نہیں ہوجاتی اس وقت تک وہ کلمات صوفیہ کی باریکیوں اور اس طائفہ علیہ کے مقامات تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ اس کا تعارض دور کرسکتا ہے جو تصوف کی حقیقت کے سلسلے میں آیات اور احادیث [میں] وارد ہوئی ہیں اور نہ وہ کلمات مشائخ کو ان کے محل راسخ پر صرف کرسکتا ہے(۳)۔''

حضرت مخدوم آگے فرماتے ہیں:

> ''اسی طرح بعض رسائل کا بھی سمجھنا مصطلحات تصوف سے واقفیت کے بغیر ناممکن ہے۔ جیسے بشارت الاخوان، ارشاد الاخوان، فوائد الاشرف، اشرف الفوائد یا وہ

رسالہ جو وحدۃ الوجود کی بحث میں اصطلاح تصوف کے مطابق سرزمین روم میں
میں نے لکھا تھا۔ جب میں واپس سرزمین بنگال میں پہنچا تو اس سرزمین کے لوگوں
نے اس کو پسند نہیں کیا۔ جس کا باعث یہ تھا کہ تصوف کی اصطلاحات کے دقائق اس
وقت تک اس سرزمین میں نہیں پہنچے تھے۔ پس اس عدم واقفیت کے باعث لوگوں
نے اس سے انکار کیا اور اس کی مباحث پر اعتراضات کیے کما تضرع ریاح الورد
بالجعل (جس طرح گلاب کی خوشبو جعل نامی کیڑے کو مضطرب کر دیتی ہے) حسود
گرنتواند شنید عیب نیست (حاسد اگر نہ سن سکے تو کوئی حرج نہیں ہے) جعل بود متنفر ز
نکہت گل (گوبر کا کیڑہ خوشبو سے نفرت کرتا ہے۔) (۴)"

اسلام، کفر اور محبت کا صوفیانہ مفہوم:

اسلام و کفر کی حدود سے نکل کر محبت کی وادیوں کی سیر کرنے کی تمنا صوفیانہ شاعری کا بڑا محبوب و مقبول مضمون ہے۔ یہ بات بظاہر کفر ہے اور جو لوگ صوفیانہ اسرار و رموز سے واقف نہیں ہوتے وہ فتوے کا تیر چلانے میں دریغ بھی نہیں کرتے۔ وہابی تحریک کے وابستگان اور اس سے متاثرین کے ہاں یہ رویہ بالعموم پایا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ صوفیہ کی فکر بہت اعلیٰ اور ان کے رموز بڑے دقیق ہوتے ہیں۔ مثلاً جب وہ اسلام سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں تو معاذ اللہ ان کا مقصود دین محمدی سے بیزاری نہیں ہوتا، بھلا یہ کب ممکن ہے۔ یہی جماعت تو درحقیقت دین محمدی کے حاملین کاملین کی ہے، ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ یقین کے بغیر بظاہر منافقانہ احکام کی بجا آوری سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ کیوں کہ ایسا اسلام مفتی کی نظر میں اور عام لوگوں کی نظر میں تو اسلام ہے، حقیقت میں وہ سرے سے اسلام ہی نہیں ہے، نفاق ہے۔ یہ وہی اسلام ہے جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ (الحجرات: ۱۴) (گنواروں نے کہا کہ ہم ایمان لے آئے، آپ ان سے کہہ دیں کہ تم ایمان نہیں لے آئے، بلکہ یہ کہو کہ اسلام لے آئے، ابھی تو ایمان تمھارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا) اب بظاہر جس اسلام کی مذمت اور اس سے برأت کا اظہار قرآن کریم کر رہا ہے، صوفیہ کریں تو اس میں حیرت کیا ہے؟

علمائے سو کے مجادلات، تکفیرات اور تضلیلات جس کی روشنی میں سب ایک دوسرے کے مزعومہ اسلام کی روشنی میں کافر و فاسق ٹھہرتے ہیں، بسا اوقات جب صوفیہ اپنی شاعری میں اسلام سے برأت کا اظہار کرتے ہیں تو ان کی مراد وہی علمائے سو کا مزعومہ اسلام ہوتا ہے جس کے مطابق روئے زمین پر کوئی مسلمان ہی نظر نہیں آتا۔ صوفیہ کے ہاں اس قسم کے اور معانی ہیں جن کو وہ بہتر سمجھتے ہیں اس لیے ان کے ظاہری کلام سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔

اسی طرح بسا اوقات صوفیہ کفر کی مذمت کرتے ہیں اور بسا اوقات کفر کی مدح وثنا بھی کرتے ہیں۔ پہلی شق تو واضح ہوتی ہے۔لیکن دوسری صورت بہتوں کے لیے باعث الجھن بن جاتی ہے۔صوفیہ جب کفر کی مدح کررہے ہوتے ہیں تو اس وقت کفر سے ان کی مراد وہ حقائق ہیں جن کا یقین کرنا عین ایمان ہے۔لیکن اظہار کفر،مثلاً اللہ ربُّ العزت کو خالق شر کہنا کفر ہے۔لیکن واقعہ یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خالق الخیر والشر کہنا کفر نہیں ہے۔والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا جاتا ہے۔کائنات میں جو کچھ ہورہا ہے،سب کا فاعل صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے۔لیکن بہت سے امور ایسے ہیں جن کی نسبت براہ راست اللہ کی ذات کی طرف کرنا کفر ہے۔حلول واتحاد سے پاک عینیت کا عقیدہ رکھنا صوفیہ کے یہاں فرض ہے، وہ اس فرض کو بھی اپنی اصطلاح میں کفر کہتے ہیں۔یہ ان کی اپنی اصطلاح ہے،اس لیے ہر مسئلے کو اور ہر بات کو لغت اور علم کلام سے نہیں سمجھنا چاہیے۔ورنہ صوفیہ کے فیوض و برکات سے محرومی یقینی ہے۔واضح رہے کہ کفر کا مشہور و متعارف معنی علم کلام کی خاص اصطلاح ہے، ورنہ لغوی طور پر اس کے معنی اور بھی آتے ہیں۔خود قرآن پاک میں یہ لفظ متعدد معنی میں استعمال ہوا ہے۔مثلاً فاذکرونی اذکرکم واشکرولی ولاتکفرون (بقرۃ:۱۵۳) میں کفر ناشکری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔وما یفعلوا من خیر فلن یکفروہ(آل عمران:۱۱۵)اس آیت میں کفر حق مارنے کے معنی میں ہے اور ان الانسان لظلوم کفار (ابراہیم:۳۴) میں کفار ناشکرے کے معنی میں ہے۔قالوا آمنا باللہ وحدہ و کفرنا بما کنا بہ مشرکین (غافر:۸۴) میں کفر شرک سے انکار کے معنی میں ہے اور یہ معنی محمود ہے۔لکفرنا عنہم سیئاتہم (مائدۃ:۶۵)اس میں تکفیر گناہوں کے مٹانے کے معنی میں ہے جو کہ محمود معنی ہے اور اسی طرح فمن تصدق بہ فھو کفارۃ لہ (مائدۃ:۴۵) میں کفارہ گناہوں کو مٹانے والے عمل کے معنی میں ہے اور یہ بھی محمود معنی ہے۔لیکن کفر کے معانی میں سے ایک معنی متکلمین کی اصطلاح ہے جس معنی میں لفظ کفر بالعموم استعمال ہوتا ہے۔یعنی رسالت محمدی کا انکار اور یہ کفر کا قبیح ترین معنی ہے۔اسی طرح صوفیہ کی اپنی اصطلاح ہے جس سے آگہی کے بغیر صوفیانہ کلام کی تفہیم ناممکن ہے۔کفر وشرک کو صوفیہ کس طرح سے محمود معنی میں استعمال کرتے ہیں اس کی ایک جھلک حضرت میر عبدالواحد بلگرامی کے اس اقتباس میں دیکھیے:

وہ ایمان جو کفر میں پوشیدہ ہے،ایک یہ ہے کہ وہ ہمیشہ حق کی تسبیح میں مصروف ہے:

ہمیشہ کفر در تسبیح حق است　　　وان من شئی گفت ایں جا چہ دق است

کفر ہمیشہ حق کی تسبیح میں مصروف ہے اور اس میں کسی کو پریشانی کیا ہوسکتی ہے جبکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: وان من شئی الا یسبح بحمدہ ولکن لا تفقھون تسبیحھم (کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں جو اس کی حمد وتسبیح نہ کرتی ہو،لیکن تم اس کی تسبیح سمجھ نہیں پاتے۔)

دوسرے یہ کہ خلقت روحانی کسی حکمت کے تحت ہی ہے ورنہ اس کی پیدائش عبث ٹھہرے۔

تیسرے یہ کہ اس کی پیدائش حق تعالیٰ کے آثار و افعال سے ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر فعل میں اپنی حمد فرمائی۔ **اللہ المحمود فی کل افعالہ** (اللہ تعالیٰ اپنے سارے افعال میں محمود ہے)

جو شخص ترقی کر کے اس مقام تک پہنچ جاتا ہے تو کفر قبیح کی قباحت اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور اسے ناچار کہنا پڑتا ہے کہ کافرم گرکفر را دارم قبیح اور جس نے یہ کہا کہ مشرکم گر آورم ایماں صریح، اس بنا پر کہا کہ ایمان اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، لہٰذا ایمان کی نسبت اپنے فعل واختیار کی جانب کرنا طریقت میں شرک ہے(۵)۔

رہی بات عشق ومحبت کی مدح وثنا کی تو یہ تو صوفیہ کا عین مقصود ہے۔ صوفیہ ان آیات کا مظہر ہوتے ہیں:

یُحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗ (المائدہ: ۵۴) (اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے) **وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ** (البقرہ: ۱۶۵) (مومنین کاملین اللہ کے عاشق زار ہوتے ہیں)۔ بقول مولانا روم:

عشق دریائیست قعرش ناپدید	درنہ گنجد عشق در گفت و شنید

حضرت مولانا نظامی گنجوی قدس سرہ السامی کا شعر یاد آ گیا جو موجودہ منکرین تصوف کے لیے کوہ گراں سے کم نہیں۔

العشق ھواللہ ھواللہ ھواللہ	اللہ طلبی، رو بہ رہ عشق نظامی

اسلام وکفر اور محبت کے حوالے سے کتب اصطلاحات کے چند حوالے ملاحظہ کیجیے:

لفظ اسلام کا صوفی مفہوم:

سید شریف علی جرجانی ''التعریفات'' میں اسلام کی تعریف میں فرماتے ہیں:

> ''اسلام، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو تسلیم کرنے اور ان کا احترام کرنے کا نام ہے۔ کشاف میں ہے: قلب کی موافقت کے بغیر جو زبانی اقرار ہے، وہ اسلام ہے اور جس میں دل اور زبان ساتھ ساتھ ہو جائیں، وہ ایمان ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ شافعی مذہب ہے، امام ابو حنیفہ کے مذہب میں اسلام وایمان میں کوئی فرق نہیں(۶)۔''

اس تشریح کی روشنی میں صوفیہ جس اسلام کی مدح کرتے ہیں، یہ امام ابو حنیفہ کی اصطلاح والا اسلام ہے اور جب وہ مذمت کرتے ہیں تو ان کی مراد وہ اسلام ہے، جو شافعی مسلک کے اصطلاح کے مطابق اسلام ہے۔ الحاصل وہ ہر ایسے اسلام سے بری ہیں، جس میں یقین کی دولت نہ ہو، کیوں کہ ایسا اسلام اہل دنیا کی نظر میں مقبول ہے، لیکن یہ نفاق کل قیامت کے روز دو کوڑی کا بھی نہ ہوگا۔

چراغ دہلی خواجہ نصیر الدین محمود کے محبوب ومنظور مرید وخلیفہ شیخ محمد ابو جعفر مکی اپنی تصنیف بحر المعانی میں رقم طراز ہیں:

''اہل کمال کے نزدیک ایمان کا چھوٹے سے چھوٹا درجہ دل کی تصدیق ہے اور اکثر اس کی انتہا نہیں ہوتی (۷)۔''

سالکین راہ طریقت تمام قیل وقال سے ماوریٰ ہوکر ایمان کے اسی چھوٹے سے چھوٹے درجے کے حصول کے لیے مضطرب و بیتاب ہوتے ہیں اور کبھی عالم مستی میں ان علمائے سو کے دین پر جملے کس جاتے ہیں جن کا مقصود دل کی آبادی کی جگہ فقط دنیوی عزت وشہرت تک محدود ہوتا ہے۔

حضرت شاہ تراب علی قلندر کاکوروی فرماتے ہیں:

''اسلام مجازی ممکن اور واجب کو ایک دوسرے سے غیر سمجھنے کو کہتے ہیں (۸)۔''

الحذر! یہ وہ نادر و نازک مقام ہے جس کے ادراک سے عقول متوسطہ ہی نہیں بسا اوقات عقول عالیہ بھی عاجز و درماندہ رہ جاتی ہیں اور نتیجے کے طور پر جماعت صوفیہ پر اعتراضات قائم کر کے لوگ اپنا نامۂ اعمال سیاہ کر لیتے ہیں۔ اسی مقام کا ایک منظر وہ ہے جسے فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خان نے ایک نعتیہ شعر میں اظہار کیا ہے:

ممکن میں یہ قدرت کہاں واجب میں عبدیت کہاں　　حیران ہوں یہ بھی ہے خطا، یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں

صوفیہ کا نظریہ وحدۃ الوجود جب تک سمجھ نہ آجائے، یہ لقمہ گلے سے نیچے نہیں اتر سکتا۔ اس مقام پر پہنچ کر بسا اوقات صوفیہ اپنے وجود کی نفی کر جاتے ہیں۔ حضرت شاہ کاظم قلندر کاکوروی کا یہ شعر اسی تناظر میں ہے:

گھر باہر اب وہی ہیں کاظم　　ہم ناہیں ہم ناہیں ناہیں

لیکن یہ نفی ان کی مخصوص اصطلاح کے مطابق ہوتی ہے۔ یہاں لغت میں مکتوب نفی مراد نہیں ہوتی۔ سفاہت میں ڈوبے ہوئے لوگ جس کا حوالہ دے کر عرفا پر سب سے بڑی سفاہت کفر کا فتویٰ دے ڈالتے ہیں۔ صوفیہ اپنی کمند ستاروں سے بھی آگے ڈالتے ہیں۔ یہ جماعت اپنے دشت جنوں میں جبریل امین تک رسائی کو بھی زبوں صیدے سے تعبیر کرتی ہے۔ ان کی کمند عرفان میں جب تک ذات بحت کا اجالا نہیں ہوجاتا وہ اپنے کو اسلام سے دور اور کفر میں غلطاں وپیچاں تصور کرتے ہیں۔ اس مقام سے نیچے کا جو اسلام ہے ان کی نظر میں وہ مطلوب اسلام نہیں ہے۔ وہ ایسے اسلام کو اسلام مجازی سے تعبیر کرتے ہیں، اس لیے بسا اوقات اس کے حوالے سے ان کے لہجے میں یک گونہ کرختگی پائی جاتی ہے۔ وہ اسلام حقیقی کے طالب ہوتے ہیں جس میں غیریت کے تمام تصورات فنا ہوجاتے ہیں۔ المختصر! صوفیہ کا اسلام وہ اعلیٰ ترین اسلام ہے جو مقام وحدۃ الوجود کے عرفان کے بعد کھلتا ہے، جو لوگ اس کی کامل تفہیم چاہتے ہیں وہ پہلے کتابوں کی مدد اور پھر کسی مرد دانا کی قربت میں رہ کر وحدۃ الوجود کا عرفان حاصل کریں۔

اصطلاحات تصوف میں اُردو زبان میں معروف ومقبول کتاب ''سر دلبراں'' میں سید شاہ محمد ذوقی نے بھی شاہ تراب علی قلندر کاکوروی کی موافقت کی ہے، ص: ۷۴ پر مرقوم ہے:

''اسلام حقیقی سے صوفیہ کے نزدیک مراد یہ ہوتی ہے کہ ممکن اور واجب میں غیریت نہ پائی جائے۔اسلام مجازی سے صوفیہ کے نزدیک مراد یہ ہوتی ہے کہ ممکن اور واجب میں غیریت کا امتیاز کیا جائے (۹)۔''

صوفیہ کے کلام میں جہاں کہیں اسلام سے بیزاری کا عنصر نظر آتا ہے وہاں یہی تاویل کرنی چاہیے کہ ان کا نشانہ اسلام مجازی ہے نہ کہ اسلام حقیقی، لیکن یہ بات ان کو نہیں سمجھ آسکتی جو ہر مسئلے کو لغت کی کتابوں سے حل کرتے ہیں اور جن کے یہاں حقیقت و مجاز، کنایہ و استعارہ اور تشبیہ و تاویل کا گزر نہیں۔ دوسرے لفظوں میں ادب اور بلاغت سے نا آشنا مولوی محض عام شاعروں کے کلام کو نہیں سمجھ سکتا چہ جائیکہ صوفی شعرا کا کلام سمجھے، جو درحقیقت امام الکلام ہے۔

خانقاہ کاظمیہ کاکوری ہی کے ایک جواں سال عالم مولانا حافظ شبیب انور علوی، اسلام کے صوفیانہ مفہوم پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسلام یہ تسلیم و رضا سے ہے۔یعنی انبیا علیہم السلام کی مکمل پیروی کرنا۔اس کی دو قسمیں ہیں، اسلام شرعی اور اسلام طریقی، اسلام شرعی یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ، شریعت مکرمہ کے احکام بجالانا۔ اسلام طریقی یعنی ریاضت شاقہ، کسب نفس کشی، ذکر و شغل اور مراقبہ وغیرہ کرنا۔بعضوں نے مزید دو قسمیں کی ہیں۔اسلام مجازی اور اسلام حقیقی۔اسلام مجازی ممکن اور واجب کو غیر جاننا یعنی ایک کو دوسرے سے الگ کرنا ہے اور اسلام حقیقی ممکن کو واجب سے غیر نہ جاننا ہے (۱۰)۔''

صوفیہ بسا اوقات اسلام شرعی سے اسلام طریقی کی طرف یا اسلام مجازی سے اسلام حقیقی تک پہنچنے کی دعوت دیتے ہیں۔ جسے تقشّف زدہ فقیہ سمجھ نہیں پاتا اور ایک عارف پر اسلام سے بغاوت و ارتداد کا فتویٰ جڑ دیتا ہے۔صوفیہ ایسے فتویٰ بکف مولویوں کو زبان حال سے جواب دیتے ہیں:

تو و طوبیٰ، و ما و قامت یار   فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

ایسے فقیہوں کے سرمایۂ تحقیق پر کسی شاعر کا یہ ریمارک بھی پڑھنے کے قابل ہے:

خواجہ پندارد کہ دارم حاصلے   حاصل خواجہ بجز پندار نیست

لفظ کفر کا صوفی مفہوم:

حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کے الفاظ میں کفر تاریکی، عالم اور تفرقہ کو کہتے ہیں جب کہ کافر صاحب اعمال کو کہتے ہیں (۱۱)۔ظاہر ہے جس کے اسلام کا سرمایہ یقین کے بغیر صرف چند ظاہری اعمال ہوں اس کے کفر میں کس کافر کو شک ہوسکتا ہے یا جو شخص عمل کر کے فخر و مباہات اور انانیت میں ڈوبا ہوا ہے یا جو اپنے عمل ہی پر نہ تکیہ کیے بیٹھا ہے

ابھی وہ یک گونہ کفر وشرک کے مرض میں مبتلا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ایسا ہے جو ایمان تو لایا ہے لیکن اس پر لا فاعل الا اللہ اور لا حاکم الا اللہ کا راز پورے طور پر منکشف نہیں ہوا ہے، ایسا شخص عالم تفرقہ میں ہے۔ ابھی اس پر توحید کے اسرار پورے طور پر نہیں کھلے ہیں۔ صوفیہ اس مقام کو بھی اپنے مقام عالی کی طرف نسبت کرتے ہوئے مقام کفر وشرک سے تعبیر کرتے ہیں۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں:

دریں نوعے از شرک پوشیدہ است   کہ زیدم بیازرد وعمرم بخست

(اس مقام میں بھی یک گونہ شرک پوشیدہ ہے، اگر کوئی کہتا ہے کہ مجھے زید نے تکلیف پہنچائی اور عمر نے زخمی کیا)

صاحب بحر المعانی کاشف اسرار یزدانی شیخ محمد ابوجعفر حسینی مکی (خلیفۂ مجاز حضرت خواجہ چراغ دہلی) کے مجموعۂ مکاتیب ''بحر المعانی'' کے دو مکتوب ۱۸، ۱۹ کفر کے موضوع پر ہیں۔ مکتوب کو شیخ نے فارسی اشعار سے شروع کیا ہے، ان میں ایک شعر یہ بھی ہے:

ہرچند پرستیدن بت مایۂ کفر است   ما کافر عشقیم ازیں بت نہ پرستیم

اس کے بعد رقم طراز ہیں:

> ''جانو! کہ عشق اور عاشقی میں سوائے ملامت اور کفر کی سیاہی کے کچھ نہیں ہے، اس سبب سے کہ سیاہی سفیدی کی مظہر ہے، اے محبوب! جب تک زلف احدیت کی سیاہی کی خلعت نہ پہنو گے واللہ ہرگز جام احدیت کی سفیدی نہ نوش کرو گے۔ کیا سمجھتے ہو کہ اس حضرت کی زلف کیا ہے اور کون ہے۔ جانو کہ اس حضرت کی زلف محمد مختار ہے۔ کیا خوب سیاہی کہ اس نے سفیدی میں جلوہ دکھایا ہے (۱۲)۔''

اگلے صفحے پر رقم طراز ہیں:

> ''بیچارہ اہل ظواہر کا معدہ شیر خواروں کے معدے جیسا ہے جو حلوا اور بھنے ہوئے پکوان ہضم نہیں کر سکتا، جب گزک ہی برداشت نہیں کر سکتے تو شراب خالص کیا برداشت کریں گے۔ کیا جانیں کہ کیا کہتا ہوں، اے محبوب! کفر تین طرح پر ہے۔ ایک کو جلال دوسرے کو جمال کہتے ہیں اور تیسرے کفر کو الٰہی کہتے ہیں۔ کفر الٰہی کو توجہ سے سنو اور پیش نظر رکھو تا کہ کفر جلال کا مشاہدہ کرو، راہ چلو تا کہ ایمان ہاتھ آئے، پھر جان دے دو تا کہ دوسرے اور تیسرے کفر کو دیکھو پھر جان کو کھو دو تا کہ اس کے بعد چوتھے کفر تک پہنچو جو بحر المعانی میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ ان شاء اللہ دقائق المعانی میں چاروں کی مفصل شرح کروں گا۔ جب پیر فقیر کی بدولت چاروں کفروں کا مشاہدہ کرو گے تب

مومن ہو گے۔ دیکھو کہ حضرت جلت قدرتہ نے خود اس مقام کو مفصل بیان کیا ہے۔ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ (۱۲/۱۰۲) ترجمہ: اور ان میں سے بہت سے لوگ ایمان نہیں لائے اور وہ مشرک ہیں۔ جب مومن ہو گے تو تمھاری خودی اس کی خودی میں محو ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ تم پوری طرح ''وہ'' ہو جاؤ گے۔ تمّ الفقر (فقر اختتام کو پہنچ گیا) عدم میں معدوم ہو جائے گا۔ مقام الفقر هو الله (فقر اللہ ہے) کی ابدی سلطنت مسلم ہو جائے گی۔ جیسا کہ خواجہ عالم علیہ السلام نے فرمایا: کاد الفقر أن يكون كفرا (فقر قریب ہے کہ کفر ہو جائے) خواجہ عالم علیہ السلام نے اس مقام کو پورا فرما دیا اور خلائق سمجھتے ہیں کہ اس حدیث کے عام معنی ہیں۔ اے محبوب کوئی نہیں جس سے کہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو میرا جیسا کر دے تا کہ خدائی علوم کو جو نبی اور علی سے متجلی ہو کر اس فقیر کا کشف حال ہوتے ہیں بیان کروں تا کہ اہل کمال کا فیض آپ کی بدولت قیامت تک جاری رہے۔''

والله كفرت بدين الله والكفر واجب لی وعند المسلمين الظاهرين قبيح (خدا کی قسم میں نے کفر کیا اللہ کے دین کے ساتھ اور کفر میرے لیے واجب ہے اور ظاہری مسلمانوں کے نزدیک برا ہے۔)

ماہ رویا عشق تو گر کافری است   زیں چنیں صد کافری دین من است

(ص: ۳۶۰۔۳۶۱)

مجھے معلوم ہے کہ بادۂ توحید میں سرشار حضرات میری اس تحریر کے سبب مزید الجھنوں کا شکار ہو جائیں گے، ان شاء اللہ ان کے ازالے کے لیے کبھی دوسرے موقعے پر خامہ فرسائی کی جائے گی۔ اس وقت مقصود صرف ان مدعیان تصوف کو دعوت فکر دینا ہے جو جنید و شبلی، غزالی و رومی اور غوث و خواجہ کے بلند بانگ نعرے بھی لگاتے ہیں، ان کے سلسلوں میں بیعت بھی ہوتے ہیں، ان کے مزارات پر تبرک و توسل کے لیے حاضری بھی دیتے ہیں، مگر اس کے باوجود ہر وقت فتویٰ بکف ہوتے ہیں، صوفیہ کی زبان وحال سے نا آشنا اور ان کے اشعار و واردات پر معترض ہوتے ہیں۔ حضرت سید جعفر مکی کے مذکورہ بالا اقتباسات پڑھ کر ان کے طوطے ضرور اڑیں گے، لیکن شخصیت اتنی بڑی ہے کہ فتویٰ کا تیر چلانے سے پہلے یہ حضرات یقیناً سو بار سوچیں گے۔ میرا مقصود صرف یہ ہے کہ مسلک و مشرب اور زبان و بیان کی فہم کے حوالے سے ان کے اندر ایک تجسس پیدا ہو اور وہ اپنے مرشدین و مربین کی بارگاہ میں حاضر ہو کر ان معانی وحقائق کو سمجھنے کی کوشش کریں تا کہ صوفیہ کی طرف ان کا انتساب فقط لفظی و رسمی نہ رہ جائے، حقیقی اور معنوی ہو جائے۔

صوفیہ اپنی شاعری میں کفر کی مدحت کیوں کرتے ہیں اور مذمت کیوں کرتے ہیں، حضرت سید جعفر مکی کے مذکورہ

دونوں اقتباس کو سامنے رکھیے تو اس کا جواب واضح طور پر مل جائے گا۔ کفر کی مذمت وہ عام معنوں میں کرتے ہیں جسے ہر شخص سمجھتا ہے۔ لیکن وہ جس کفر کی مدحت کرتے ہیں وہ کس قدر اعلیٰ ہے کہ حضرت جعفر مکی اپنے لیے اسے واجب کہہ رہے ہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ کفر کے معنی ظلمت اور حجاب کے ہیں۔ جب کہ صوفیہ کفر سے مراد زلف احدیت کی سیاہی لیتے ہیں اور زلف احدیت کی سیاہی سے ان کی مراد محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا جمال ہوتا ہے۔ بھلا پھر اس کی عظمت و وجوب میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ زبان ایسی ہے جسے نہ زاہد خشک سمجھ سکتا ہے اور نہ فقیہ شہر کو اس کی ہوا لگ سکتی ہے۔ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی ایک مقام پر اہل اللہ کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہم کرنے والا اصطلاح قوم سے ناواقفی کے باعث کمال عظمت کو معاذ اللہ موجب اہانت گمان کرتا ہے اور اہل ظاہر پر انکار کلمات اہل اللہ میں اکثر بلا اسی دروازے سے آتی ہے، ان کی اصطلاح کو اپنے مفہوم پر حمل کرتے اور خطا میں گرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ:

ہندیاں را اصطلاح ہند مدح — سندیاں را اصطلاح سند مدح
در حق او مدح در حق تو ذم — در حق او شہد و در حق تو سم
در حق او ورد و در حق تو خار — در حق او نور و در حق تو نار
توچہ دانی زبان مرغاں را — کہ نہ دیدی گہے سلیماں را

محمد شاہ بادشاہ دہلی کے حضور مجمع علما تھا۔ بعض کلمات منسوبہ با اولیا پر رائے زنی ہو رہی تھی۔ ہر ایک اپنی سی کہتا، اور اعتراض کرتا۔ ایک صاحب کہ اس جماعت میں سب سے اعلم تھے، خاموش تھے۔ بادشاہ نے عرض کی آپ کچھ نہیں فرماتے؟ فرمایا یہ سب صاحب میرے ایک سوال کا جواب دیں تو میں کچھ کہوں۔ سب ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے فرمایا آپ حضرات بولی کتے کی سمجھتے ہیں؟ سب نے کہا: نہ! کہا بلی کی؟ کہا: نہ! کہا سبحان اللہ تم مقر ہو کہ ارذل خلق اللہ کی بولی تم نہیں سمجھتے، اولیا کہ افضل خلق اللہ ہیں، ان کا کلام کیوں کر سمجھ لو گے؟ (۱۳)

حضرت مولانا شاہ تراب علی قلندر کاکوروی کبر و کفر کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''اس سے عالم ملکوت و عالم لاہوت مراد ہیں (۱۴)۔''

ظاہر ہے کہ جب کفر کا مفہوم اس قدر اعلیٰ ہے تو یقیناً سالک، عارف جو عالم ملکوت و لاہوت کا مسافر ہوتا ہے، وہ کفر کی آرزو کرے گا اور نتیجے کے طور پر آخرت میں توفیق الٰہی سے سرفراز بھی ہوگا اور دنیا میں اگر اس کی یہ آرزو لفظوں کے پرستار کسی شیخ حرم تک پہنچ گئی تو اس کے کفر و ارتداد کے فتوے بھی عام کر دیے جائیں گے اور اگر بالفرض علمائے سو نے اس پر کنٹرول پا لیا تو اسے بھی منصور حلاج کی طرح دار و رسن کے پھندے چومنے پڑ سکتے ہیں۔ یہی عالم عارف شیخ تراب علی قلندر کاکوری ایک دوسرے مقام پر کافر کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کافر اس کو کہتے ہیں جو صفات و اسماء و افعال کے مرتبے سے گزر گیا ہو اور حق کو تعینات و تکثرات کے پردے میں دیکھتا ہو(۱۵)۔''

اسی تناظر میں کسی عارف نے کہا ہے:

خود را نہ پرستیدۂ عرفاں چہ شناسی   کافر نہ شدی لذت ایماں چہ شناسی

جس سے ملک سلیمان سے ناواقف حضرات کچھ نہیں سمجھتے اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، **اللھم ھدیۃ الحق**۔

شاہ تراب علی قلندر نے کفر کا جو اعلیٰ مفہوم بیان کیا ہے، اس کے علاوہ صوفیہ کے یہاں کفر کا ایک اور مفہوم ہے، کفر کا یہ دوسرا مفہوم ہم عام مسلمانوں کے لیے عزت و عظمت کا سامان ہے مگر عرفا اسے اپنے لیے پستی اور کم ہمتی تصور کرتے ہیں۔ مطالب رشیدی ص: ۳۷۷ پر رقم طراز ہیں:

''کفر عالم تفرقہ کی ظلمت کو کہتے ہیں۔''

ظاہر ہے عالم تفرقہ میں قدم راسخ ہونا اور اللہ کی ذات و صفات اور خالقیت و رزاقیت پر کامل ایمان ہونا ہم عام مسلمانوں کے لیے معراج سے کم نہیں، لیکن صوفیہ اسے پستی اور ظلمت سے تعبیر کرتے ہیں اور اس مقام پر پہنچ کر بھی خود کو مومن نہیں سمجھتے، اس سے اوپر اٹھتے اور عالم جمع اور جمع الجمع تک رسائی کے لیے بے تاب ہوتے ہیں۔ اس مقام تک رسائی کو وہ عین ایمان سمجھتے ہیں، اس سے نیچے تو ان کی اصطلاح میں ''ہنوز اند کے شرک پوشیدہ است۔''

اب مقام جمع و فرق کیا ہے، تھوڑی سی اس کی وضاحت بھی دیکھ لیں تا کہ یہ اندازہ کیا جا سکے کہ کفر جسے صوفیہ عالم تفرقہ کی ظلمت کہتے ہیں وہ بالذات کس قدر بلند و رفیع ہے۔ امام ابوالقاسم قشیری فرماتے ہیں:

''لفظ الجمع والتفرقة يجري في كلامهم كثيرا، وكان الأستاذ أبو علي الدقاق يقول: الفرق ما نسب اليك والجمع ما سلب عنك، ومعناه أن ما يكون كسبا للعبد من إقامة العبودية وما يليق بأحوال البشرية فهو فرق وما يكون من قبل الحق من إبداء معان وإسداء لطف وإحسان فهو جمع، هذا أدنى أحوالهم في الجمع والفرق، لأنه من شهود الأفعال، فمن أشهده الحق سبحانه أفعاله من طاعته ومخالفاته فهو عبد بوصف التفرقة ومن أشهده الحق سبحانه ما يؤليه من أفعال نفسه سبحانه فهو عبد يشاهد الجمع، فاثبات الخلق من باب التفرقة واثبات الحق من نعت الجمع، ولا بد للعبد من الجمع والفرق، فان من لا تفرقة له

لاعبودية له ومن لا جمع له لا معرفة له ، فقوله: إياك نعبد
اشارة إلى الفرق، وقوله: وإياك نستعين إشارة إلى الجمع (١٦)۔"

لفظ جمع وفرق صوفیا کے کلام میں بہت زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔ استاذ ابوعلی دقاق فرماتے تھے: جو کچھ تمھاری طرف منسوب ہو وہ فرق ہے اور جس کی تم سے نفی ہو وہ جمع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندے کا کسب مثلاً بندگی اور دیگر افعال بشریت، فرق ہے اور جو کچھ حق تعالیٰ کی طرف سے ہو، مثلاً معانی کا اظہار اور لطف واحسان کی عطا، وہ جمع ہے۔ جمع و فرق کے تعلق سے صوفیہ کی یہ معمولی حالت ہے۔ چوں کہ یہ افعال کے شہود سے ہے، جسے حق تعالیٰ اس کی اپنی اطاعت و معصیت دکھاتا ہے وہ بندہ وصف تفرقہ سے متصف ہوتا ہے اور جسے حق تعالیٰ اس کے خود کے افعال دکھاتا ہے وہ حالت تفرقہ میں ہے اور جسے حق تعالیٰ اپنا فعل دکھاتا ہے وہ حالت جمع کا مشاہدہ کرتا ہے۔ گویا خلق کا اثبات باب تفرقہ سے ہے اور حق کا اثبات باب جمع سے ہے، لہٰذا بندے کو جمع وفرق دونوں کی ضرورت ہے، جس کے اندر فرق نہ ہو اس میں عبودیت نہیں اور جس میں جمع نہ ہو اس کے اندر معرفت نہیں۔ قول باری اياك نعبد حالت فرق کی طرف اشارہ ہے اور اياك نستعين جمع کی طرف اشارہ ہے۔

ظاہر ہے کہ حالت تفرقہ ایک محمود حالت ہے، نہ کہ مذموم حالت، لیکن اس کے باوجود بعض صوفیہ کا اسے کفر کہنا اس کی مذمت کے لیے نہیں بلکہ اس سے اعلیٰ حالت جمع کی تلاش وجستجو کے لیے ہے۔

کفر وکافر کے تعلق سے اب ذرا سید محمد ذوقی شاہ کی تشریحات بھی ملاحظہ کیجیے، فرماتے ہیں:

"کفر: ظلمت تفرقہ، کثرت کا وحدت میں پوشیدہ کر دینا، بحر احدیت جس میں کثرات وتعینات فنا ہو جاتے ہیں، ہر چیز حتی کہ اپنی ذات تک کو ذات الٰہی میں گم کر دینا، اسمائے جلالی کے تحت میں آجانا:

لب دریا ہمہ کفر است و دریا جملہ دینداری ولیکن گوہر دریا ورائے کفر و دیں باشد

کفر حقیقی: سالک کا ذات کو عین صفات اور صفات کو عین ذات جاننا، ذات حق کو ہر جگہ دیکھنا، بجز ذات حق کے کسی چیز کو موجود نہ جاننا، وحدت میں یک رنگ ہو کر ماسوا سے پاک ہو جانا۔

کفر مجازی: ناشکری ذات حق اور گمراہی۔

کافر: صاحب اعمال جو مرتبۂ اسماء وصفات وافعال سے بلند نہ ہوا ہو اور حق کو تعینات وتکثرات میں پوشیدہ رکھتا ہو، کبھی اسے بھی کافر کہہ دیتے ہیں جو شہود ذات بحت تک پہنچ گیا ہو یا جو حقیقت کا مجاز میں مشاہدہ کرتا ہو۔

کافر بچہ: عالم وحدت میں جس نے یک رنگی حاصل کر لی ہو جو ماسوا سے روگرداں ہو کر سواد ہستی میں جاگزیں ہو گیا ہو اسے کبر بھی کہتے ہیں (١٧)۔"

یہاں پر اب یہ نکتہ محتاج بیان نہیں رہا کہ صوفیانہ شاعری میں جب کفر کی مذمت ہوتی ہے تو یہاں صوفیہ اور

متکلمین ایک جگہ کھڑے ہوتے ہیں، لیکن یہ کفر مذمومہ صوفیہ کی اصطلاح میں کفر مجازی ہے۔اس کے برعکس جب صوفیہ کفر کی مدح کرتے ہیں۔اس وقت کفر محمود و مطلوب معنی میں ہوتا ہے۔صوفیہ اسے کفر حقیقی کہتے ہیں اور اس کے حصول کے بعد ہی ایمان کی تکمیل سمجھتے ہیں۔لیکن جن کا ذہن متکلمین کی خاص اصطلاح سے لبریز ہو چکا ہو اور مزید اس میں کسی سمائی کی گنجائش نہ ہو، انھیں ہمیشہ صوفی سے شکایت رہتی ہے۔لیکن ایسے قابل رحم تنگ دماغوں سے کیا شکایت کرنا جنھوں نے عرفان کی دنیا کا نہ کبھی نظارہ کیا اور نہ صاحبان عرفان سے صحیح معنوں میں محبت کی۔محبت کی ہوتی تو کچھ تو ضرور جانتے اور کم از کم زبان بند رکھتے تا کہ اہل عرفان اور صاحبان حق کا فیض انھیں ملتا رہتا۔

حافظ شاہ شبیب انور علوی نے کفر کے مفہوم کو مزید کھولا ہے، ملاحظہ کیجیے:

> ''کفر: یہ ناشکری کے معنی میں ہے، اصطلاحاً اس کی دو قسمیں ہیں کفر مجازی اور کفر حقیقی ،کفر مجازی وہ ہے جو کفار و مشرکین میں ہے۔جس میں شرک اور اللہ تعالیٰ کی ناشکری ہے۔کفر حقیقی یہ ہے کہ ذات محض کو اس طرح ظاہر کرے کہ سالک ذات حق کو عین صفات اور صفات کو عین ذات جانے جیسا کہ ہے، ذات حق کو ہر جگہ دیکھے اور سوائے ذات حق کے کسی کو موجود نہ جانے۔ یہ حقیقت میں توحید و ایمان ہے، اگر چہ عوام کو کفر معلوم ہوتا ہے۔بعض صوفیہ نے لکھا ہے کہ کافر اور گمراہ وہ شخص ہے جو وحدت میں یک رنگ ہو کر ماسوا اللہ سے پاک ہو گیا، بہر حال دونوں معنوں کا مرجع ایک ہے۔کفر کے معنی ظلمت کے بھی ہیں کیوں کہ نور سے ظہور اور ظلمت سے پوشیدگی ہے(۱۸)۔''

صوفیہ کے مفہوم کو سمجھنے میں اگر اب بھی کسی کوژ ولیدگی کا سامنا ہے تو اب مزید ہم اس کی تفہیم سے قاصر ہیں، ایسے شخص کے حق میں صرف دعا ہی کی جا سکتی ہے۔**اللھم! اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین أنعمت علیھم غیر المغضوب علیھم و لا الضّالین۔**

لفظ محبت کا صوفی مفہوم:

شیخ ابوالقاسم قشیری فرماتے ہیں:

> ''محبت دل وارفتہ کے میلان مسلسل کا نام ہے، ایک قول یہ ہے کہ تمام دوستوں پر محبوب کو ترجیح دینے کا نام محبت ہے۔ایک قول کے مطابق حضور و غیبت ہر حال میں محبوب کی موافقت کا نام محبت ہے۔کسی نے کہا محب کا اپنی تمام صفات کو مٹا دینے اور محبوب کی ذات کو باقی رکھنے کا نام محبت ہے، کسی نے کہا محبت رب کی مرضی میں دل کی موافقت کرنا ہے اور کسی نے کہا اطاعت کرتے رہنے اور بے ادبی

سے ڈرتے رہنے کا نام محبت ہے۔ شیخ بایزید بسطامی نے کہا: اپنی کثیر چیزوں کو کم جاننا اور محبوب کی قلیل چیزوں کو زیادہ جاننا، محبت ہے۔ حضرت سہل کا قول ہے: محبت اطاعت سے ہم آغوش رہنا اور مخالفت سے دور رہنا ہے۔ حضرت جنید بغدادی سے محبت کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: محب کے اوصاف کی جگہ محبوب کے اوصاف کا آجانا محبت ہے۔ حضرت جنید کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ محبوب کا ذکر غالب آجائے یہاں تک کہ محب کے قلب پر محبوب کے اوصاف کا ذکر غالب رہے اور اپنے اوصاف سے بلکہ ان کے احساس سے بالکلیہ تغافل ہو۔ شیخ ابوعلی رودباری نے کہا: محبت موافقت کا نام ہے۔ شیخ ابوعبداللہ القرشی نے کہا کہ حقیقت محبت یہ ہے کہ تم اپنے محبوب کو اپنا سب کچھ دے دو، یہاں تک کہ تمھارے لیے کچھ بھی تمھارا نہ ہو۔ حضرت شبلی نے فرمایا کہ محبت کو محبت اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ دل سے ماسوا المحبوب کو مٹا دیتی ہے (۱۹)۔''

شیخ ابوبکر کلاباذی فرماتے ہیں:

''بعض مشائخ کا فرمان ہے، محبت کی دو قسمیں ہیں، محبت اقرار، یہ خاص و عام سب کے لیے ہے، صحیح طریقے سے محبتِ وجد، اس میں نفس و خلق سے نظر اٹھ جاتی ہے حتی کہ اسباب و اقوال بھی نظر نہیں آتے، سالک ان امور کے مشاہدے میں غرق ہوتا ہے جو اللہ کے لیے ہیں یا اس کی طرف سے ہیں (۲۰)۔''

یہ عشق و محبت کیا بلا ہے، ایک عاشق زار سے سنیے، شیخ ابوجعفر مکی بحر المعانی کے اندر مذکور اپنے ساتویں مکتوب کو اس طرح شروع کرتے ہیں:

''عشق اندر فضل و علم و دفتر و اوراق نیست — ہر چہ گفت و گوئے باشد آں رہ عشاق نیست
شاخ عشق اندر ازل واں بیخ عشق اندر ابد — کیں شجر را تکیہ بر عرش و ثری و ساق نیست

اے محبوب! میں مست ہوں، ہر چند چاہتا ہوں کہ عشق سے احتراز کروں، لیکن عشق مجھے پریشان اور سرگرداں رکھتا ہے اور حضرت خواجہ علیہ السلام نے فرمایا: من عشق و کتم و عف و مات مات شھیدا (جس نے عشق کیا اور اسے چھپایا اور پاک باز رہا اور مر گیا وہ شہید مرا) زہے برخورداری کی دولت و عفت۔

کارم اندر عشق مشکل می شود — نام و ننگم در سر دل می شود

من ہمی خواہم کہ بگریزم ز عشق — عشق پیش از من بہ منزل می شود'' (۲۱)

حضرت مخدوم سمناں سلطان اشرف جہانگیر سمنانی فرماتے ہیں:

محبت: حق سبحانہ وتعالیٰ سے بغیر کسی سبب اور علاقہ کے اور بغیر کسی متحرک کے دوستی (۲۲)۔

درد: اس حالت کا نام ہے جو محبت سے محب پر طاری ہو جاتی ہے اور اس کے برداشت کرنے کی محب میں طاقت نہیں ہوتی (۲۳)۔

عشق: محبت مفرط کا نام

معشوق: حق تعالیٰ جب اس کی طلب حد کمال پر پہنچ جائے، اس اعتبار و یقین کے ساتھ کہ من جمیع الوجوہ وہی مستحق دوستی ہے۔

عاشق: حق کا متلاشی (۲۴)

شاہ تراب علی قلندر کا کوروی عاشق کی تعریف میں لکھتے ہیں:

''ایسا شخص مراد ہے جو لواحق (تعلقات) دنیا سے گزر گیا ہو اور معشوق حقیقی ہی کو دیکھتا ہو اور رنج ومحنت پر راضی وشاکر رہتا ہو (۲۵)۔''

حضرت کے بقول یہ اصطلاح حافظ کی ہے۔ عطار، عراقی، مغربی، بوعلی شاہ قلندر اور رومی کی مصطلحات کے مطابق عشق، عاشق اور معشوق کی تعریف میں لکھتے ہیں: ''عشق: ذات حق کو کہتے ہیں اور اس کو عالم لاہوت بھی کہتے ہیں۔''

معشوق: صفات حق کو کہتے ہیں اور اسی کو عالم جبروت اور وحدت اور تعین اول اور برزخ کبریٰ اور ام الکتاب اور روح اعظم اور حقیقت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی کہتے ہیں۔

عاشق: اسمائے حق کو کہتے ہیں اور اس کو واحدیت اور مرتبۂ آدم اور تجلی ثانی اور عالم شہادت اور منشائے کثرت اور عالم ملکوت اور عالم ماسوا اور عالم معانی بھی سمجھتے ہیں (۲۶)۔''

یہی شاہ تراب علی قلندر، خواجہ محمد پارسا کی اصطلاح کے مطابق عاشق ومعشوق کی تعریف یوں لکھتے ہیں:

''عاشق: جمال وجلال الٰہی کے شیفتہ کو کہتے ہیں جو طلب اور جد (کوشش) کے بعد حاصل ہو۔

معشوق: حق کو کہتے ہیں جو طلب میں پوری کوشش کرنے کے بعد نصیب ہو، اس لیے کہ مستحق دوستی وہی ہے اور بس (۲۷)۔''

حضرت مخدوم سمناں اور حضرت شاہ تراب علی کا کوروی کی مذکورہ بالا تشریحات کے بعد اب یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ آخر کیا وجہ ہے کہ صوفیہ ذرۂ درد محبت پر ہمہ دم کفر و ایمان بلکہ دونوں جہان کو نچھاور کرنے کو تیار نظر آتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جسے اس کا وصال ہو جائے اسے دونوں جہان ہی کیا، کروڑوں جہان کی کیا غرض، صادقین عرفا کی جماعت کو نہ جہنم کا خوف ہوتا ہے اور نہ جنت کی لالچ، یہ ہمہ دم خالق جہنم اور مالک جنت کے طالب ہوتے ہیں، اس کی یاد، اس کی فکر اور اسی کے وصال میں کائنات کو اور خود اپنی ذات کو محو کیے رہتے ہیں۔

صاحب سر دلبراں سید شاہ محمد ذوقی نے عشق ومحبت اور دردِ عشق پر طویل اور دلچسپ گفتگو کی ہے۔ ہم اس سے صرف دو اقتباس نقل کرتے ہیں:

جو عشق کہ حضرت انسان کو عطا فرمایا گیا ہے اس میں درد ہے، تڑپ ہے، سوز ہے، وہ عشق ایک آتش ہے جو عشاق کو جلاتی رہتی ہے۔ آتش دوزخ بیگانوں کو جلاتی ہے اور آتش عشق یگانوں کو، یہ عشق ہی ہے کہ ایمان اس کے بغیر کامل نہیں ہوتا، عبادت اس کے بغیر ناقص رہتی ہے، عبادت بغیر عشق کے بے کار اور عشق بغیر عبادت کے ناتمام۔ جو طاعت محبت سے کی جاوے وہ اس طاعت سے بہتر ہے جو خوف کی وجہ سے کی جاوے، عبادت بلا عشق زہد خشک ہے اور زہد خشک سے بدتر دنیا میں کوئی آزار نہیں، عشق دنیا وآخرت کے غموں سے فارغ کر دینے والی چیز ہے۔ سلوک کا دارومدار اسی عشق پر ہے۔ بغیر اس عشق کے انسان بے لطف اور مزدوروں کی زندگی بسر کرتا ہے:

مرحبا اے عشق خوش سودائے ما	اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت وناموس ما	اے تو افلاطون و جالینوس ما
جسم خاک از عشق بر افلاک شد	کوہ در رقص آمد و چالاک شد
عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت	ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
در نگنجد عشق در گفت و شنید	عشق دریائیست قعرش ناپدید
شرح عشق ار من بگویم بر دوام	صد قیامت بگذرد آں ناتمام
عاشقی پیداست از زاری دل	نیست بیماری، چوں بیماری دل
ملت عشق از ہمہ دینہا جداست	عاشقاں را مذہب و ملت خداست

مگر یہ عشق وہی ہے جس میں درد کی چاشنی ہو، انسان کے لیے درد وعشق باہم لازم وملزوم ہیں، موجب ترقی درد ہے۔ عشق بدوں درد موصل بہ مطلوب نہیں، موصل بہ مطلوب جو چیز ہے وہ درد ہے۔

درد حاصل کن کہ در ما درد تست	در دو عالم داروئے جاں درد تست
ذرۂ دردت دہ اے درمان من	زانکہ بے دردت بمیرد جان من
کفر کافر را و دیں دیندار را	ذرۂ دردت دل عطار را‘‘(۲۹)

شاہ محمد ذوقی ’’عشق کی صوفیانہ تعریف‘‘ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''جب وجود حقیقی ایک ہے اور کائنات میں سب کچھ اسی کی کسی نہ کسی صفت کا پرتو ہے اور حقیقت حال یہ ہے کہ

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کرد | پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردہ

جب خود بینی وخودنمائی کے تیر ایک ہی ترکش سے نکل رہے ہیں، جب کہ نظر ومنظور، شاہد ومشہود، طالب ومطلوب کی اصل ایک ہے تو تصوف کی زبان میں عشق ومحبت کی تعریف یہ ہوگی کہ جمیل حقیقی کا جمعاً اور تفصیلاً اپنے کمال کی جناب میلان (۳۰)۔''

آگے بڑھنے سے پہلے عشق کے مضمون پر چند ابیات حضرت شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ العالی کے بھی ملاحظہ کرتے چلیں:

عشق جذب و شوق کی بنیاد ہے | عشق سے سیر و سلوک آباد ہے
عشق کے مکتب کا ملّا عشق ہے | درسِ ابجد کا خلاصہ عشق ہے
عشق سے بڑھ کر نہیں کوئی عظیم | عشق ہے بر حق صراطِ مستقیم
در حقیقت عشق ہے میروں کا میر | بے محابا عشق ہے پیروں کا پیر
عشق ہو جاتا ہے جب بڑھ کر جواں | کفر بن جاتا ہے ایماں بے گماں
عشق کی گفتار ہے گفتارِ حق | عشق کی رفتار ہے رفتارِ حق
عاشقانِ حق کا یہ فرمان ہے | جس پہ ہر پیر و جواں قربان ہے
عشق ہی خود دین اور ایمان ہے | عشق ہی خود مصحفِ قرآن ہے
عشق ہی مسجد ہے اور عشق ہی اذاں | عشق ہی سجدہ سجودِ پنجگاں
عشق مستیٔ فنا فی اللہ ہے | عشق ہستیٔ بقا باللہ ہے
عشق ہے نورِ ظہورِ کبریا | عشق ہے وجہ نمودِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
بالیقیں جو صورتِ رحمٰن ہے | بے محابا جلوۂ سبحان ہے

عشق کے صوفیانہ مفہوم میں کتنی وسعت، پہنائی اور گہرائی ہے اس کی ایک جھلک مذکورہ بالا اشعار وتشریحات میں دیکھی جاسکتی ہے۔ علامہ اقبال نے بھی بہت خوب صورتی سے اس بے کرانی کو سمیٹتے ہوئے لکھا ہے:

عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفیٰ | عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

صوفیہ اسی عشق کے بحر ناپیدا کنار کے شناور ہوتے ہیں، زاہد تنگ نظر اپنے مزعومہ ایمان واسلام کے تنگنائے میں جب ان نفوس قدسیہ کو نہیں پاتے تو نتیجۃً وہ اپنی تنگ نظری کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان نفوس قدسی صفات پر دائرہ ایمان سے خروج کا فتویٰ لگا دیتے ہیں۔ یہاں خطا ان فتویٰ بکف مولویوں کی نہیں ہے، خطا اس تربیتی نظام کی ہے جہاں ان مجاہدین کو گولیاں چلانے کی تربیت تو دی جاتی ہے، ملک فتح کرنے اور بچانے کی تربیت نہیں دی جاتی۔ ان کے دلوں کو جوش فراواں

سے سرشار تو کر دیا جاتا ہے مگر ذہن کی کھڑکیاں حسب سابق بند کی بند ہی رہ جاتی ہیں۔ عصر حاضر میں دینی تعلیمی نظام کے اندر معلومات کے ساتھ اخلاقیات اور علم کے ساتھ شعور کی تربیت از حد ضروری ہوگئی ہے۔ ذوقی شاہ نے کتنی چبھتی ہوئی لطیف بات کہی کہ ''عبادت بلا عشق، زہد خشک ہے اور زہد خشک سے بدتر دنیا میں کوئی آزار نہیں۔''

اب ظاہر ہے کہ جو لوگ اس آزار میں مبتلا ہوں، ان سے کسی خیر و اور فہم و بصیرت کی کیا توقع رکھی جاسکتی ہے۔ وہ اس قسم کے اشعار کو کیا سمجھیں گے:

عشاقِ روضہ سجدے میں سوئے حرم جھکے　　اللہ جانتا ہے کہ نیت کدھر کی ہے
پیش نظر وہ نوبہار سجدے کو دل ہے بے قرار　　روکیے سر کو روکیے ہاں یہی امتحان ہے

خرد سے کہہ دو کہ سر جھکالے گماں سے گزرے گزرنے والے
پڑے ہیں یاں خود جہت کے لالے کسے بتائے کدھر گئے تھے
سراغ این ومتی کہاں تھا نشان کیف والی کہاں تھا
نہ کوئی راہی نہ کوئی ساتھی ، نہ سنگ منزل نہ مرحلے تھے
پر ان کا بڑھنا تو نام کو تھا حقیقۃً فعل تھا ادھر کا
تنزلوں میں ترقی افزا، دنیٰ تدلیٰ کے سلسلے تھے
اٹھے جو قصر دنی کے پردے کوئی خبر دے تو کیا خبر دے
وہاں تو جا ہی نہیں دوئی کی، نہ کہہ کہ وہ بھی نہ تھے ، ارے تھے
حجاب اٹھنے میں لاکھوں پردے ہر ایک پردے میں لاکھوں جلوے
عجب گھڑی تھی کہ وصل و فرقت جنم کے بچھڑے گلے ملے تھے
وہی ہے اول وہی ہے آخر وہی ہے باطن وہی ہے ظاہر
اسی کے جلوے اسی سے ملنے اسی سے اس کی طرف گئے تھے

(فاضل بریلوی)

یہ اور اس جیسے اشعار صحیح معنوں میں وہی سمجھتے ہیں جنھیں عشق کی سرفرازیوں کا حصہ ملا ہو یا کم از کم جن کے اندر سرفرازان عشق ومحبت کے ساتھ حسن ظن کا مضبوط رشتہ قائم ہو۔ درد محبت سے نا آشنا ظلمتوں اور فرقتوں میں جینے والے، بدگمانیوں، بدتمیزیوں اور غلط فکریوں اور غلط کاریوں میں مبتلا اشخاص عشق ومحبت کی واردات کو کیا جانیں؟ عاشق صادق دنیا میں ہوتے ہوئے بھی دنیا کی حدود سے باہر ہوتا ہے۔ وہ رنج ومحن اور فضل ونعم ہر حال میں شاکر وساجد ہوتا ہے۔ وہ معشوق حقیقی کے جلووں میں گم ہوتا ہے، القدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ کا راز اس پر عیاں ہوتا ہے، ان الحکم الا للہ کی تمام تر

حقیقتیں اس کے حضور عملی شکل میں بے حجاب ہوتی ہیں۔ خلقکم و ماتعملون کی جلوہ سامانیاں اس کی نگاہوں میں ہوتی ہیں۔ زاہد خشک ایسے دیوانوں کو ہوش میں لانے کی تدبیر کرتا ہے، ایسے فرزانوں کو وہ ایمان واسلام کے ابتدائی اسباق پڑھانے کے لیے بے چین ہوتا ہے۔ جب کہ یہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتے ہیں، یہ عشق کے بندے بحث وجدال کی دنیا اور کشف وکرامات کی سرحدوں سے بہت آگے نکل چکے ہوتے ہیں۔ عشاق حق کی نظر میں صرف ایک مطلوب ہوتا ہے ذات حق، جب عشق کے رشتے کو بھی من اللہ پاتے ہیں تو وہ اپنی عاشق کو بھی بھول جاتے ہیں۔ دوئی کا تصور مٹ جاتا ہے۔ کیوں کہ ان پر یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ فاعل حقیقی صرف ایک ہے اور جب فاعل حقیقی صرف ایک تو عاشق و معشوق کا جھگڑا کہاں، بلکہ خود عشق کی غیریت کیسی، یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر عرفا بسا اوقات کفر وایمان کی غیریت پر خندہ زن ہوتے ہیں۔لیکن یہ خندہ زنی ان کے مقام، حال اور اصطلاح کی مطابق ہوتی ہے۔ جو لوگ ان کی اصطلاح سے بے خبر ہیں وہ کچھ سے کچھ معنی نکال لیتے ہیں۔ جب صاحب عرفان اپنی مخصوص اصطلاح اور لب و لہجے میں نعرہ زن ہوتا ہے کہ:

ملت عشق از ہمہ ملت جداست — عاشقاں را مذہب و ملت خداست
کفر کافر را ودیں دیندار را — ذرۂ دردت دل عطار را
رندے دیدیم نشستہ بر خنگ زمیں — نہ کفر و نہ اسلام و نہ دنیا و نہ دیں
ما وعشق یار اگر در قبلہ و در بت کدہ — عاشقان دوست را با کفر وایماں کار نیست

تو اصطلاح تصوف سے نا آشنا یہ سمجھنے لگتا ہے کہ شاید صوفیہ کا دین ومذہب اسلام سے الگ ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ روح اسلام کے حامل ہوتے ہیں، وہ روح کے متلاشی ہوتے ہیں اور ظاہر بیں انھیں جسم کا منکر سمجھ لیتا ہے۔ وہ عشق الٰہی کے طلب گار ہوتے ہیں اور اس تقویٰ اور خودنمائی سے بیزار ہوتے ہیں جس میں انسان گرفتار انا ہوکر اپنا ہی طواف شروع کر دیتا ہے۔ صوفیہ زاہدان خشک کی طرح عبادت بلاعشق پر نازاں نہیں ہوتے۔ بلکہ اپنی عبادت کے اندر اس درد کو تلاش کرتے ہیں جو وصال الٰہی کا مرکب ہے، اس تلاش حقیقت کو تنگ نظر اسلام سے خروج سمجھتے ہیں تو طالبان مولیٰ ان کے اس ''مخصوص اسلام'' سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ عرفائے حق تو تصور غیریت کو بھی کفر سمجھتے ہیں جسے عام لوگ حقیقت اسلام سمجھے ہوئے ہوتے ہیں۔صوفیہ اس اسلام کو اپنے لیے کفر سمجھتے ہیں اور اس سے آگے نکل کر بحر وحدت میں غوطہ زن ہوتے ہیں۔ قل ھو اللہ احد، ان الحکم الا للہ، خلقکم وما تعملون اور القدر خیرہ وشرہ من اللہ کے جلوے جب بے نقاب ہوتے ہیں تو غیریت کے سارے حجاب اوہام وخیالات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ بحر عشق ومحبت میں جب صوفی ڈوب جاتا ہے اور لا فاعل الا اللہ اور اس سے آگے بڑھ کر لا موجود الا اللہ کی حقیقت جب اس پر منکشف ہوتی ہے تو وہ بانگ دہل پکار اٹھتا ہے:

سر سرم جان جانم من نیم من نیم واللہ یاراں من نیم

نہ کافر ہوں ،نہ مومن ہوں ،نہ عصیاں ہے ،نہ طاعت ہے
غلام شاہ خادم ہوں، مرا مذہب محبت ہے
کہاں ایمان کس کا کفر اور دیر و حرم کیسے
ترے ہوتے ہوئے اے جاں خیال دوجہاں کیوں ہو

اس کے سامنے قرص آفتاب بے حجاب ہوتا ہے،توحید نکھری اور کھلی ہوتی ہے،مگر اندھا اس توحید کو انکار سمجھتا ہے اور آشوب چشم میں مبتلا مریض ایک آفتاب کو دو چار دیکھتا ہے اور الشرک الشرک پکارنے لگتا ہے۔جب نظر خراب ہو تو اس میں نظارے کا کیا قصور! ایسے اندھوں،تنگ نظروں اور آشوب چشموں کے بیچ جب کوئی صاحب نظر گھر جاتا ہے تو بے ساختہ پکار اٹھتا ہے:

عشق را با کفر و با ایماں چہ کار عاشقاں را لحظئ با جاں چہ کار
ہر کرا در عشق محکم شد قدم در گذشت از کفر از اسلام ہم

(عطار)

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست
خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند آرے آرے می کنم باخلق مارا کار نیست

(خسرو)

بت خانہ و کعبہ کچھ نہ جانا کہاں جائیں خلاف کفر و دیں ہم

(آسی غازی پوری)

کفر کہاں اسلام کدھر ہے گبر و مسلماں کہتے ہیں کس کو کعبہ ہمیں ہیں دیر ہمیں ہیں تسبیح و زنار ہمیں ہیں
مفتی نے دیے کفر کے فتوے میرے اوپر اتنا نہیں سمجھا مجھے میں کون بشر ہوں

(اشرفی میاں)

کفرواسلام کی سرحد سے الگ دور کہیں اک نئی دنیا محبت کی بسائے کوئی

(شیخ ابوسعید)

کم سے کم وہ لوگ جو تصوف کا دم بھرتے ہیں،غوث وخواجہ کا نعرہ لگاتے ہیں اور طریقت کے کسی نہ کسی سلسلے سے وابستہ ہیں،ان کا فرض ہے کہ وہ اصطلاحات صوفیہ کو سمجھیں اور تصوف وارباب تصوف کے ساتھ حسن ظن قائم کریں۔ اہل قبلہ کوئی بھی ہو،اس کے قول وعمل میں ہر ممکن تاویل تلاش کرنے کی کوشش کریں،امت مسلمہ انتشار در انتشار کے

مرحلوں سے گزر رہی ہے، ایسے میں ایمان وکفر کے حوالے سے کسی شخص معین پر رائے دینے کے لیے متکلمین کے مشکل ترین پیمانے سے مسئلے کی نوعیت کو انتہائی حد تک مخلصانہ طور سے سمجھنے کی کوشش کریں۔

افسوس! کہ آج تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا ہے، تصویر ہی بدل گئی ہے، اب اہل اسلام کے کفریہ قول میں ایمان واسلام کا ضعیف پہلو تلاش نہیں کیا جاتا بلکہ ان کے اسلامی اقوال میں کفر کے ضعیف پہلو تلاش کر کے اپنے جذبات واشتعالات کو تسکین پہنچائی جاتی ہے۔ اسلام کے حق میں یہ رویہ بہت مضر ہے۔

حواشی:

(۱) عبدالواحد بلگرامی، میر، سبع سنابل (لاہور: مکتبہ قادریہ، ۱۹۸۲ء)، ص ۱۶۳۔
(۲) ایمن امین عبدالغنی، الکافی فی البلاغة (قاہرہ: دارالتوفیقیہ، ۲۰۱۱ء)، ص ۱۶۳۔
(۳) اشرف جہانگیر کچھوچھی، سیّد، لطائف اشرفی، ۱/ ۳۰۵ (کراچی: ۱۹۹۹ء)، ص ۳۰۵۔
(۴) ایضاً، ص ۳۰۶۔
(۵) عبدالواحد بلگرامی، میر، سبع سنابل، محوّلہ بالا، ص ۱۶۳۔
(۶) شریف علی جرجانی، سیّد، التاریفات (لبنان: دارالمعرفة، ۲۰۱۳ء)، ص ۲۸۔
(۷) محمد ابوجعفر مکی، شیخ، بحر المعانی، مکتوب اول (خانقاہ کاکوری، ۲۰۱۰ء)، ص ۴۳۔
(۸) تراب علی قلندر کاکوروی، حضرت شاہ، مطالب رشیدی (خانقاہ کاکوری، ۲۰۱۲ء)، ص ۳۶۴۔
(۹) شاہ محمد ذوقی، سیّد، سرِّ دلبراں (دہلی: ادبی دنیا، مٹیا محل، ۲۰۰۶ء)، ص ۴۷۔
(۱۰) شبیب انور علوی، مولانا، حافظ، اصطلاحاتِ تصوف (خانقاہ کاکوری، ۲۰۰۷ء)، ص ۲۵۔
(۱۱) اشرف جہانگیر کچھوچھی، سیّد، لطائف اشرفی، ۱/ ۶۹۵، محوّلہ بالا، ص ۶۹۵۔
(۱۲) محمد ابوجعفر مکی، شیخ، بحر المعانی، محوّلہ بالا، ص ۲۵۹۔
(۱۳) احمد رضا خان، مولانا، فتاویٰ رضویہ، ۳۰/ ۸۸ (پوربندر، ۲۰۰۵ء)، ص ۳۰۔
(۱۴) تراب علی قلندر کاکوروی، حضرت شاہ، مطالب رشیدی، محوّلہ بالا، ص ۳۶۶۔
(۱۵) ایضاً، ص ۳۶۹۔
(۱۶) ابوالقاسم قشیری، امام، الرسالة القشیریة (مصر: مصطفی بابی، ۱۹۵۹ء)، ص ۳۸۔
(۱۷) شاہ محمد ذوقی، سیّد، سرِّ دلبراں، محوّلہ بالا، ص ۲۹۰۔۲۹۱
(۱۸) شبیب انور علوی، مولانا، حافظ، اصطلاحاتِ تصوف، محوّلہ بالا، ص ۱۵۷۔
(۱۹) ابوالقاسم قشیری، امام، الرسالة القشیریة، محوّلہ بالا، ص ۱۸۵۔۱۸۶
(۲۰) ابوبکر کلاباذی، شیخ، التعرف لمذہب اہل التصوف (مصر: دارالمقطم، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۰۴۔
(۲۱) محمد ابوجعفر مکی، شیخ، بحر المعانی، محوّلہ بالا، ص ۱۰۰۔۱۰۱
(۲۲) اشرف جہانگیر کچھوچھی، سیّد، لطائف اشرفی، ۱/ ۶۹۲، محوّلہ بالا، ص ۶۹۲۔
(۲۳) ایضاً، ص ۶۹۴۔
(۲۴) ایضاً، ص ۶۹۷۔

(۲۵) تراب علی قلندر کاکوروی، حضرت شاہ، مطالب رشیدی، محوّلہ بالا، ص ۳۶۵۔

(۲۶) ایضاً، ص ۳۶۷۔

(۲۷) ایضاً۔

(۲۸) ایضاً۔

(۲۹) شاہ محمد ذوقی، سیّد، سرِّ دلبراں، محوّلہ بالا، ص ۲۵۹۔

(۳۰) ایضاً، ص ۲۶۔

مآخذ:

۱۔ بلگرامی، عبدالواحد، میر، سبع سنابل، لاہور: مکتبہ قادریہ، ۱۹۸۲ء۔

۲۔ جرجانی، شریف علی، سیّد، التاریفات، لبنان: دارالمعرفۃ، ۲۰۱۳ء۔

۳۔ ذوقی، شاہ محمد، سیّد، سرِّ دلبراں، دہلی: ادبی دنیا، مٹیا محل، ۲۰۰۶ء۔

۴۔ رضا، احمد خان، مولانا، فتاویٰ رضویہ، ۳۰/۸۸، پوربندر، ۲۰۰۵ء۔

۵۔ عبدالغنی، ایمن امین، الکافی فی البلاغۃ، قاہرہ: دارالتوفیقیہ، ۲۰۱۱ء۔

۶۔ علوی، شبیب انور، مولانا، حافظ، اصطلاحاتِ تصوف، خانقاہ کاکوری، ۲۰۰۷ء۔

۷۔ قشیری، ابوالقاسم، امام، الرسالۃ القشیریۃ، مصر: مصطفیٰ بابی، ۱۹۵۹ء۔

۸۔ کاکوروی، تراب علی قلندر، حضرت شاہ، مطالب رشیدی، خانقاہ کاکوری، ۲۰۱۲ء۔

۹۔ کچھوچھی، اشرف جہانگیر، سیّد، لطائف اشرفی، ۱/۳۰۵، کراچی: ۱۹۹۹ء۔

۱۰۔ کلاباذی، ابوبکر، شیخ، التعرف لمذہب اہل التصوف، مصر: دارالمقطم، ۲۰۰۹ء۔

۱۱۔ مکی، محمد ابوجعفر، شیخ، بحرالمعانی، مکتوب اول، خانقاہ کاکوری، ۲۰۱۰ء۔